مولانا ایس ایم اکرام

مولانا شبلی کے اساتذہ

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کی زیرِ طبع تصنیف "یادگارِ شبلی" کا ایک باب۔ اس تصنیف میں علامہ شبلی نعمانی کے مفصل حالاتِ زندگی، اُن کی تصانیف اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ (مدیر)

مولانا شبلی کی تعلیم چھ برس کی عمر میں شروع ہوئی۔ اور اگرچہ ایک لحاظ سے اخذِ علوم کا سلسلہ تمام عمر جاری رہا، لیکن ۱۸۷۴ء میں جب وہ حج کی غرض سے روانہ ہوئے، اُن کی رسمی تعلیم کا خاتمہ ہو گیا۔

مولانا نے کلامِ مجید اور فارسی کی کتابیں اپنے گاؤں بندول میں پڑھیں۔ پھر اعظم گڑھ کے عربی مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ چند روز جونپور کے مدرسہ حنفیہ[1] میں بھی پڑھا۔ اس کے بعد ان کے والد نے انھیں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے غازی پور بھیج دیا، جہاں وہ صدر مدرس تھے۔ کچھ عرصہ بعد "شاگرد کی کشش اُستاد کو اعظم گڑھ کھینچ لائی"۔ اور وہ اس مدرسہ میں جو شبلی کے والد اور دوسرے معززین نے اعظم گڑھ میں قائم کیا تھا، ۱۸۷۳ء کے لگ بھگ مدرسِ اعلیٰ ہو گئے۔ مولانا شبلی کی اصل تعلیم مولانا محمد فاروق کی راہنمائی میں ہوئی اور ان کی علمی شخصیت کی چھاپ شاگرد پر بڑی گہری پڑی۔ اس لیے ہم ان کا ذکر تفصیل سے آئندہ صفحات میں کریں گے۔

مدرسہ اعظم گڑھ سے فراغت کے بعد مولانا نے اس زمانے کے دستور کے مطابق مشاہیرِ فن سے فیض حاصل کرنے کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ (۱۸۷۴ء - ۱۸۷۵ء) میں سب سے پہلے لکھنؤ گئے۔ ناتمام سیرت شبلی میں اقبال احمد صاحب سہیل لکھتے ہیں۔ "راقم نے اُستاذ مرحوم کی زبانی سُنا ہے کہ اوّل اوّل ان کو مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی شہرتِ کمال لکھنؤ لے گئی، مگر علامہ مرحوم کچھ فطری جودتِ طبع اور کچھ فیضِ فاروقی

---

[1] یہ امر قابلِ غور ہے کہ شبلی، جنھوں نے بعد میں فرطِ عقیدت سے نعمانی لقب اختیار کیا، سب سے پہلے جس قابلِ ذکر مدرسہ سے وابستہ ہوئے، اس کا نام مدرسہ حنفیہ تھا۔ کیا یہ محض اتفاق تھا، یا اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا کے والد کو بھی حنفیت سے خاص لگاؤ تھا؟

کی بدولت نقد و اجتہاد کے خوگر تھے اور جہاں جاتے، اُن کی نظر پہلے اسی جوہر کی تلاش کرتی، اِس لیے زانوئے ادب تہہ کرنے سے پہلے ہی لکھنؤ سے قدم اٹھ گئے اور رام پور کا رُخ کیا۔[1]

سید صاحب نے بھی لفظ بہ لفظ یہ عبارت حیات شبلی میں نقل کر دی ہے[2] لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ خود علامہ شبلی نے اپنے ایک ابتدائی خط میں مولانا عبدالحی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اپنے ہم عمر دوست مولوی حکیم محمد عمر کو لکھتے ہیں۔

لکھنو آمدن خواستہ بودند۔ باز از چہ باز ماندند۔ آرے

مولوی عبدالحی صاحب (را) دلے دانا و چشم بینا عطا کردہ اند[3]

مولوی عبدالحلیم شرر نے جو بقول سید سلیمان ندوی "مولانا (شبلی) کی جوانی کے دوست تھے"[4] مولانا کی وفات پر جو اہم مضمون لکھا، اس میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ اگرچہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی علمائے حنفیہ میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتے تھے، لیکن "بخلاف تمام موجودہ علمائے حنفیہ کے ائمہ حنفیہ سلف میں سے جس کے قول کو اہلِ حدیث کے مذہب سے قریب تر پاتے، اختیار کر لیتے اور بہت سے مسائل میں اہلِ حدیث کے ہم خیال تھے، چنانچہ نماز میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں امام محمد کا مذہب اختیار کر لیا تھا اور سورۂ فاتحہ پڑھنا مستحب بتاتے تھے۔ یہ امر مولانا شبلی کو سخت ناگوار گزرا،

---

[1] الاصلاح - دسمبر ۱۹۳۶ء - ص ۵۱

[2] سید صاحب نے صرف یہ عبارت ہی نہیں بلکہ باقی سارا پیراگراف بھی سیرت شبلی سے نقل کیا ہے۔ بغیر کسی تصریح کے انھوں نے حیات شبلی میں عمومی طور پر اُس مدد کا ذکر کیا ہے، جو انھیں مولوی عبدالسلام کے مسودہ حیات شبلی اور سہیل صاحب کی نامکمل سیرت شبلی سے ملی۔ (اگرچہ وہ نواب حبیب الرحمٰن شروانی کے اضافوں کو ان دونوں کی معاونت سے کہیں زیادہ وقیع قرار دیتے ہیں) لیکن طویل عبارتوں کو بغیر کسی وضاحت کے نقل کرنے کا نتیجہ ہے کہ (۱) یہ پتہ نہیں چلتا کہ "راقم" کون ہے؟ بظاہر حیات شبلی کی عبارت سے سید سلیمان ہی مولانا عبدالحی والی عبارت کے راوی معلوم ہوتے ہیں، لیکن سیرت شبلی سے معاملہ (کم از کم ایک حد تک) مختلف نظر آتا ہے (۲) چونکہ سہیل صاحب نے بھی مولوی عبدالسلام کی (قلمی) حیات شبلی سے استفادہ کیا تھا اور وہ بھی علامہ شبلی کے شاگرد تھے تو ناممکن نہیں کہ سیرت شبلی کا اندراج ان کے بیان پر مبنی ہو (گو یہ غیر اغلب ہے)

[3] مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۲۴۴ [4] حیات شبلی ص ۷۲

چنانچہ ان کی تردید میں ایک عربی رسالہ شائع کر دیا، جس کا نام اسکات المعتدی تھا[1]

رسالہ کی تحریر چند سال بعد کا واقعہ ہے۔ لیکن عجب نہیں کہ مولانا عبدالحی کی دانائی اور چشم بینا کا معترف ہونے کے باوجود شبلی کا ان کے درس سے مستفید نہ ہونا اختلافِ مسلک کی وجہ سے ہو۔

مولانا ارشاد حسین مجددی رح

فرنگی محل لکھنؤ سے قطع نظر کرنے کے بعد مولانا رام پور گئے، جہاں مشہور و معروف خیرآبادی خاندان کے علاوہ مولانا ارشاد حسین مجددی رح کی ذات مرجع خلائق تھی۔ خیرآبادی بزرگوں کو معقولات میں امتیاز حاصل تھا، جس میں شبلی نے مولانا فاروق کے فیض سے کامل استعداد حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ وہ مولانا ارشاد حسین کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے۔ اس سلسلے میں سید سلیمان لکھتے ہیں "علامہ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعتِ نظر، اصابت رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا اور اکثر بہ سبیلِ تذکرہ ان کے کمالِ فہم و ادراک اور قوتِ تفقہ کے واقعات بیان فرماتے۔ مولانا ارشاد حسین نہایت متشدد حنفی تھے۔ مولوی نذیر حسین کی ایثار الحق کے جواب میں انتصار الحق انہی نے لکھی ہے۔ اور علامہ مرحوم کو بھی فقہ حنفی کی حمایت میں بہت غلو تھا۔ غالباً یہ بھی ایک وجہ انتخاب ہوئی ہو۔ بہرحال مولانا نے حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کی۔ یہ تعلیم غالباً سال بھر جاری رہی[2]"

سید صاحب نے مولانا ارشاد حسین سے اخذِ فیض کا جو تخمینہ لگایا ہے، وہ مولانا محمد فاروق کی مدتِ درس سے بہت کم ہے۔ لیکن مولانا شبلی کے دوسرے اساتذہ (خلاً مولانا فیض الحسن سہارنپوری) کی میعادِ فیض رسانی سے کہیں زیادہ ہے۔ اس سے اور مولانا کے اُن کی نسبت جو خیالات بیان کیے گئے ہیں، ان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا شبلی کے قدیمی رنگ کے علمی مجسموں میں مولانا محمد فاروق کی ذاتِ گرامی کے بعد سب سے زیادہ فیض انھوں نے مولانا ارشاد حسین سے حاصل کیا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب مولانا شبلی نے "بہت جد و جہد" سے سیرۃ النعمان لکھی تو نہ صرف اس کی تالیف میں حضرت مولانا

---

[1] مضامینِ شرر جلد سوم۔ ص ۲۵۸

[2] حیاتِ شبلی۔ ص ۷۹

سے مشکلات کے حل میں مدد چاہی (ملاحظہ ہو۔ حیات شبلی ص ۱۸۱ - ۱۸۲ حواشی) بلکہ اس کتاب کا مابہ الامتیاز وہی خوبیاں ہیں جنھیں وہ مولانا ارشاد حسین سے منسوب کرتے تھے۔ یعنی "وسعتِ نظر، اصابت رائے"۔ "مجتہدانہ ژرف نگاہی"۔ "کمال فہم و ادراک اور قوتِ تفقہ"[1]

غالباً سید سلیمان کا اندراج خفیف اضافے کے ساتھ مولوی اقبال احمد صاحب کے مضمون سے ماخوذ ہے۔ لیکن استاد کے متعلق ان کا جو طویل مضمون معارف کے دوسرے نمبر میں شائع ہوا، اس میں انھوں نے "مولوی ارشاد حسین صاحب" کے متعلق لکھا کہ "جب ذکر آتا، مولانا (شبلی) اپنے استاد کی فقہ دانی اور تبحرِ دینی کی بہت مدح فرماتے تھے"[2]

مولانا فیض الحسن سہارنپوری

مولوی اقبال احمد صاحب لکھتے ہیں کہ "مولانا ارشاد حسین کے خرمنِ فیض سے خوشہ چینی کے بعد مولانا مرحوم وطن آئے"۔ مگر حصولِ کمال کی خواہش بے تاب رکھتی تھی۔ ان کا اگلا سفر لاہور کا تھا۔ جہاں مولانا فیض الحسن سہارنپوری پروفیسر اورنٹیل کالج "اس پایہ کے ادیب تھے کہ خاکِ ہند نے کئی صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام ادب پیدا کیا ہو"[3] اس زمانے میں سفر کی دشواریاں آج کل کی نسبت کہیں زیادہ تھیں۔ (مثلاً اعظم گڑھ سے جونپور تک ریل نہ تھی۔ مولانا کو یہ سفر یکہ پر کرنا پڑا) لیکن لاہور کی روانگی کے وقت خاص وجہ پریشانی یہ تھی کہ ان کے والد اُن سے اس موقع پر برہم تھے۔ مولوی اقبال احمد صاحب نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ وہ "اتنے لمبے سفر کی اجازت دینا نہیں چاہتے تھے"۔ دوسرے جدید تعلیم کی کشش اور نئے حالات میں قدیم کے مشکوک مادی فائدے۔ علامہ نے ان اسباب کی صراحت نہیں کی۔ فقط والد کے نام ایک خط میں[4] "مزاج عالی" کی "برہمی" کا ذکر کیا ہے۔ وجہ خواہ کیا ہو، لیکن یہ

---

[1] حیات شبلی ص ۷۹۔ سیرت شبلی میں مولوی اقبال احمد نے بھی یہی الفاظ استعمال کیے ہیں (الاصلاح دسمبر ۱۹۳۶ء ص ۵۲)

[2] الاصلاح دسمبر ۱۹۳۶ء ص ۵۳۔ سید سلیمان ندوی اپنے معارف والے مضمون میں مولانا فیض الحسن کی نسبت لکھتے ہیں۔ "ہندوستان کے تمام دورۂ اسلامی میں قاضی عبدالمقتدر کے سوا یہی ایک فرد ہے، جو عربی شاعری کا صحیح مذاق رکھتا تھا" (معارف جلد ۱ نمبر ۲ - ص ۱۷)

[3] مکاتیبِ شبلی میں اس خط کے نیچے "۱۲۸۹ھ" لکھا ہے لیکن حیاتِ شبلی میں سید سلیمان ندوی نے (جو مکاتیب میں مرتب بھی تھے) رام پور اور لاہور کے سفروں کے سال "۱۲۹۱ھ" و "۱۲۹۲ھ" دیے ہیں۔ سید سب تاریخیں قیاسی ہیں۔ لیکن حیاتِ شبلی کا اندراج زیادہ قرینِ صحت معلوم ہوتا ہے۔

امرِ واقعی ہے کہ اتنے دُور دراز سفر کے لیے اِس رئیس زادہ کو فقط پچیس روپے ملے جن میں سے تین اعظم گڑھ سے جونپور تک یکّہ کی نذر ہوئے۔ بارہ روپے جونپور سے لاہور تک ریل کا کرایہ۔ جب وہ لاہور پہنچے اُن کے پاس فقط دس روپے تھے۔ جب دو مہینے گزر گئے اور انتہائی کفایت کے باوجود یہ سرمایہ، کرایہ، مکان، خوراک وغیرہ پر خرچ ہو گیا۔ ابھی تک اعظم گڑھ سے مزید رقم نہ پہنچی تو فنافی العلم بیٹے نے باپ کو ایک مختصر اور مؤدبانہ مگر دل ہلا دینے والا خط لکھا اور اپنی پریشانی بیان کی۔ اس سے والد قدرتی طور پر متاثر ہوئے۔ چنانچہ مولانا کی ضروریات کا خاطر خواہ سامان ہو گیا۔ ان کے قیامِ لاہور کا جو دوسرا خط والد کے نام محفوظ ہے، اس کا آغاز ہے۔

"بخیریت ہستم و خیریت خواہِ مزاجِ اقدس۔ نامۂ والا رسید و کام رائے جان و دل گردید"۔ بلکہ انھیں ایک لندن کی چھپی ہوئی گلستان بھیجنے کا ذکر ہے، جس سے مولانا کے والد نے ان کی مالی ضروریات کا انتظام کر دیا، لیکن اس سے ان کی مشکلات کا خاتمہ نہ ہوا۔ انھوں نے لاہور کا سفر، ایک اضطراری جذبہ کے تحت، یعنی بغیر کسی پیش بندی اور ضروری انتظامات کے کیا تھا۔ نہ اورینٹل کالج میں داخلہ لیا تھا اور مولانا فیض الحسن سے کوئی خط و کتابت کی تھی۔ یہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ نہ صرف کالج میں داخلہ ناممکن ہے۔ (اگر ان کا ارادہ تھا) بلکہ کالج سے باہر کے اوقات میں بھی مولانا کے درس میں شرکت کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن اِن کا عزمِ راسخ ان مشکلات پر غالب آیا۔ "آخر کار یہ طے ہوا کہ مکان سے کالج تک کی مسافت طے کرنے میں جو وقت صَرف ہوتا ہے، اس میں مولانا درسِ ادبیات لیا کریں"۔ یہ صورتِ حالات جس حد تک غیر تسلّی بخش تھی، محتاجِ بیان نہیں۔ لیکن اب ایک نئی اُلجھن کا سامنا ہوا، کالج طویل تعطیلات کے لیے بند ہونے لگا اور مولانا فیض الحسن اپنے وطن سہارنپور کے لیے تیار ہوئے۔ اِس دُھن کے پکّے اور علم کے عاشق نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ اُستاد کے ساتھ سہارنپور پہنچنے کا پروگرام بنایا۔ والد کو لکھتے ہیں۔

> در چند روزے مدرسہ اینجا تعطیل خواہد یافت۔ تعطیل تا دو ماہ خواہد ماند۔ حضرت استاذ بوطنِ خویش یعنی سہارنپور تشریف خواہند برد۔ ایں قدر ناغہ نتواں کرد۔ مرا ہم عزمِ سہارنپور است[1]۔

مولوی اقبال احمد صاحب نے لاہور کے قیام کو "چند روزہ" کہا ہے اور سید سلیمان ندوی بھی مولانا فیض الحسن کے درس کو "قلیل المدت" کہتے ہیں، لیکن دونوں کا بیان ہے کہ شبلی کے لیے مولانا کی صحبت بہت مؤثر ثابت

---

[1] مکاتیبِ شبلی۔ جلد دوم۔ ص ۲۳۷

ہوئی اور "اسی درس نے مولانا میں عربی علم ادب کا صحیح مذاق حدِ کمال کو پہنچا دیا"۔ قرائن سے اِس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ اقبال احمد صاحب لکھتے ہیں :۔

"مولانا فاروق مرحوم، معنی آفرینی کے دلدادہ تھے اور متاخرین شعرائے عرب کو جن کا سرخیل متنبی تھا، شعرائے جاہلیت پر ترجیح دیتے تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کا بھی ابتدائی مذاق غالباً یہی رہا ہوگا۔ مگر لاہور میں آئے تو دنیا بدل گئی۔ شعرائے جاہلیت کی تاثیر میں ڈوبی ہوئی سادہ اور سچی شاعری اور شستہ و رفتہ زبان دل میں اتر گئی۔ یہاں تک کہ مولانا نے حماسہ حفظ کر ڈالی اور آخر عمر تک بلاناغہ صبح کی تلاوت کے بعد حماسہ کے اشعار گنگنایا کرتے تھے۔"

سید سلیمان نے بھی حیات شبلی میں یہی الفاظ دُہرائے ہیں۔ شبلی کے خطوط میں شعرائے جاہلیت کے قصائد کی ایک اور کتاب جمہرۃ العرب کا بھی ذکر کیا ہے، جو وہ مولانا فیض الحسن سے مانگ کر لائے تھے اور مولانا فاروق کو پڑھنے کو دی تھی۔ چنانچہ ایک خط میں اپنے دوست مولوی محمد سمیع کو لکھتے ہیں "دو نامہائے حضرت مولانا فیض الحسن پے در پے مے رسند۔ جمہرۃ العرب از جناب مولوی محمد فاروق صاحب طلب دار و بمن رسانید" اہم اور قیمتی کتابوں کی اِس عاریت سے بھی استاد اور شاگرد کے خصوصی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن مولانا فیض الحسن کے متعلق شبلی کے خیالات و جذبات کی واضح تصویر اس زوردار مرثیہ میں ہے، جو انھوں نے اُستاد کی وفات پر ۱۸۸۷ء میں لکھا۔ ابتدا کے اشعار ہیں ۔

دریں آشوبِ غم عندم بنہ گر نالہ زنی گریم ۔۔۔ جہانے را جگر خوں شد، ہمی تنہا نہ من گریم
بہ تحسینِ صبوری چند بفریبی مرا ناصح ۔۔۔ دمے بگزار تا در ماتمِ فیض الحسن گریم
بمرگش علم و فن در نالہ با من ہمنوا باشد ۔۔۔ ہنر بر خویشتن گرید، چو من بر خویشتن گریم
گہے بیخود بہ برہم گشتنِ بزمِ ہنر نالم ۔۔۔ گہے بیخویش بر روزِ سیاہِ علم و فن گریم

یہ ایک حقیقت ہے کہ شبلی نے مولانا محمد فاروق کا بھی مرثیہ نہیں لکھا۔ (اگرچہ الندوہ کے ایک نوٹ میں ان کی وفات پر اپنے خیالات کا موثر اظہار کیا ہے) لیکن مولانا فیض الحسن کا انھوں نے جو مرثیہ لکھا اور دوسرے جو شواہد ملتے ہیں ان سے خیال ہوتا ہے کہ انھیں عربی ادب کے اس امامِ فن سے تعلقِ قلبی تھا۔ ان کی مدتِ درس طویل نہ سہی، لیکن شبلی میں بلا کی قوتِ آخذہ تھی۔ انھوں نے مختصر صحبت میں بھی بڑا فیض حاصل کیا اور استاد کو بھی ان کے علمی شوق اور استعداد نے متاثر کیا تھا۔ چنانچہ جب وہ علی گڑھ کالج

کی ملازمت کے لیے کوشاں ہوئے تو مولانا فیض الحسن کی پُرزور سفارش انھیں حاصل تھی۔

دیوبند اور سہارنپور

مولانا شبلی کی تعلیم کے متعلق معمول سے زیادہ معلومات ملتی ہیں، لیکن پھر بھی بعض اُلجھنیں رہ جاتی ہیں۔ مثلاً وہ ایک اہم خط میں، جس میں مدیر العصر کے نام انھوں نے اپنے مختصر حالاتِ زندگی قلم بند کیے اور جس میں انھوں نے اپنے علمی شوق کو "والد اور گھر کی تربیت کا اثر" بتایا ہے، لکھتے ہیں۔

"دو دفعہ (طلبِ علم میں) والد کی اجازت کے بغیر چپکے سے نکل گیا"

یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ یہ دو سفر کونسے تھے، اسی طرح ان کے قیامِ دیوبند کا مسئلہ ہے، جس کے متعلق متضاد بیانات ملتے ہیں۔ اس امر پر اتفاقِ رائے ہے کہ وہ دارالعلوم دیوبند کے طالب علم کبھی نہیں رہے، لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ علم الفرائض کا ایک رسالہ انھوں نے یہاں پڑھا تھا۔ اس سلسلے میں سید سلیمان کا پہلا بیان اگست ۱۹۱۶ء کے معارف میں ہے۔

> دیوبند میں مولانا کے ایک عزیز حبیب (مولوی محمد عمر صاحب) تعلیم پاتے تھے۔ ان کے والد پروہاں تشریف لے گئے۔ چند روز ٹھہرے۔ شریکِ تعلیم نہ ہوئے اور واپس آئے۔

اس سے اگلا بیان مولوی اقبال احمد سہیل کا ہے، جو جنوری ۱۹۳۷ء کے الاصلاح میں لکھتے ہیں۔

> لاہور سے واپس ہو کر اثنائے راہ میں کچھ دنوں دیوبند قیام کیا اور ایک چلّہ میں علم الفرائض کی تکمیل کرنے کے بعد یادگارِ سلف مولانا حافظ احمد علی محدث سہارنپوری کے آستانہ پر حاضر ہوئے اور یکے بعد دیگرے صحاح کا درس لینا شروع کیا۔ شمائل ترمذی کا دورہ ہو رہا تھا کہ ذکرِ حبیب کی برکت نے دیارِ حبیب کی زیارت کا سامان مہیا کر دیا۔

سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی میں سفرِ دیوبند کی جو تفصیلات دی ہیں وہ مولوی اقبال احمد صاحب اور اُن کے اپنے پہلے بیان سے کسی قدر مختلف ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے "دیوبند کی حاضری" کا ذکر، سفرِ رامپور کے بعد اور سفرِ لاہور سے پہلے کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

> اسی زمانہ میں دیوبند کے مدرسہ میں مولانا کے چند ہم وطن اور ہم عمر دوست جیسے مرزا محمد سلیم جو بعد کو وکیل ہوئے، پڑھتے تھے۔ اس کشش سے وہ دیوبند گئے اور ایک مہینہ کے قریب رہے۔ تعلیم میں شرکت نہیں کی مگر فرائض کا علم یہیں سیکھا، یا فرائض کا رسالہ یہیں پڑھا۔ مدرسہ

دیوبند کے کتب خانہ سے بعض کتابیں، اس زمانہ میں پڑھنے کو لی تھیں، جن پر مولانا نے اپنا نام لکھا تھا۔ وہ کتابیں اب تک ہیں۔ اور ان پر ان کا نام لکھا اب تک موجود ہے۔[1]

مولانا احمد علی محدث رحمہ کی نسبت سید سلیمان صاحب کا پہلا بیان حسب ذیل تھا۔

لاہور سے مولانا، سہارنپور، مولوی احمد علی صاحب کی خدمت میں کہ محدث حنفی تھے، حاضر ہوئے یہاں کچھ دنوں علم حدیث کی تحصیل فرمائی۔

مولانائے مرحوم اپنے تمام اساتذہ میں مولوی احمد علی صاحب کے اخلاق و آداب، سادگیٔ طبع، وضع اور اتباعِ سلف کے بے حد معترف تھے اور ادب سے ان کو "ہمارے مولانا" کہا کرتے تھے۔[2]

آخر عمر میں جب سید صاحب نے (مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت کے کچھ عرصہ بعد) اس مضمون کو یادِ رفتگاں میں شامل کیا تو مندرجہ بالا عبارت میں ایک دو تبدیلیاں ہوئیں۔ ایک تو "مولوی احمد علی صاحب" کی جگہ "مولانا احمد علی صاحب" لکھا گیا۔ دوسرے مطالعہ علم حدیث کے متعلق "کچھ دنوں"[3] کی جو صراحت تھی، اسے قلم زن کر دیا گیا۔ حیات شبلی میں "مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے تعلیم حدیث" کے عنوان سے تین طویل صفحے لکھے گئے ہیں، لیکن مولانا شبلی کی تعلیم حدیث کے متعلق کوئی مزید معلومات نہیں۔ چند سطریں تمہیدی ہیں۔ قریباً ڈیڑھ صفحہ مولانا احمد علی صاحب کے حالات میں ہے اور ایک صفحہ سے زیادہ پر ان کی سندِ حدیث ہے۔ کیونکہ مولانا شبلی (اگر ان کی تعلیم حدیث مکمل ہو جاتی، تو ان) کی سند بھی اپنے استاد سے اسی سلسلہ سے ہو سکتی تھی"! مولانا شبلی کی اپنی تعلیم حدیث کے متعلق ہماری معلومات انہی سطور تک محدود ہیں، جو سید صاحب معارف میں لکھ چکے تھے۔

---

[1] حیاتِ شبلی ص ۸۰

[2] معارف نمبر ۲ جلد ۱۔ ص ۱۷۔ ۱۸

[3] مولوی عبدالحلیم شرر اپنے اس مضمون میں، جو مولانا شبلی کی وفات پر تحریر ہوا لکھتے ہیں "یہ ہمیں نہیں معلوم کہ مولانا نے حدیث کی کتابیں پڑھیں یا نہیں، اور پڑھی تو کہاں سے پڑھیں"۔ (مضامین شرر جلد سوم ص ۲۵۳) عجب نہیں کہ شبلی اپنے استاد مولانا فیض الحسن کے ساتھ کالج کی طویل تعطیلات کے شروع میں سہارنپور گئے ہوں اور تعطیلات کے بعد ان کے ساتھ لاہور نہ آئے ہوں۔ مولوی اقبال احمد صاحب کا بیان ہے کہ دیوبند کا سفر اور مولانا احمد علی کے درس میں شرکت لاہور سے واپسی پر اثنائے راہ میں ہوئی۔ غالباً اس کی مدت بہت مختصر تھی۔

عمر ۱۹ برس کی تھی۔ سال ۱۸۷۶ء تھا۔ ترمذی شریف زیرِ درس تھی کہ خاندان کے بعض افراد [اور والد] نے بغرضِ حج، سفرِ حجاز کا ارادہ کیا۔ حوصلہ مند طالب العلم کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ چنانچہ استادِ محدث سے اجازت لے کر سفرِ حجاز کے لیے روانہ ہو گئے[1]

---

[1] معارف جلد ۱ شمارہ ۲ ۔ ص ۱۸

یادگارِ شبلی

علامہ شبلی نعمانی کے مفصل حالاتِ زندگی اور اُن کی تصانیف اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ

از ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ناظم ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی مرحوم کو ہمارے ادب اور تاریخ میں جو بلند مقام حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے احوالِ زندگی سید سلیمان ندوی مرحوم نے حیاتِ شبلی میں جمع کیے تھے۔ تصانیف کے متعلق وہ ایک علیحدہ کتاب لکھنا چاہتے تھے، لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر اکرام صاحب کی اس کتاب یادگارِ شبلی میں نہ صرف مکمل حالاتِ زندگی ہیں اور اس کے ساتھ وہ مواد بھی سمیٹ لیا گیا ہے جو سید سلیمان ندوی کی تصنیف حیاتِ شبلی کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوا ہے بلکہ علامہ شبلی کی ایک ایک کتاب پر علیحدہ تفصیلی تبصرہ بھی ہے صفحات تقریباً ۵۰۰ (زیرِ طبع)

قیمت اندازاً ۔/۱۶ روپے

مجمع البحرین

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ کتاب وحدتِ امت کی طرف ایک اہم قدم ہے۔ اس میں شیعہ و سنی کی متفق علیہ روایات کو پیش کیا گیا ہے۔ شروع میں علامہ مفتی جعفر حسین قبلہ مجتہد کا تعارف و تبصرہ اور علامہ سید نصیر الاجتہادی کی تقریظ ہے۔

صفحات ۲۸ × ۲۲۲ ۔ قیمت : ۶ روپے ۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور